مسز رابعہ اقبال :

اردو میں تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق توضیحی سرمایہ

(۱)

اردو زبان میں تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق توضیحات پیش کرنے کی ابتدا مولانا شبلی سے ہوتی ہے۔ انہیں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بہت سی فضیلتیں حاصل ہیں، اور ہماری ناچیز رائے میں ایک اہم فضیلت یہ بھی ان کے حصے میں آئی ہے کہ انہوں نے گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں "الفاروق" کے مقدمے میں اور اس صدی کی ابتدائی دہائی میں "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے مقدمے میں محدثین اور اسلامی مؤرخوں کے تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق قابل قدر توضیحی سرمایہ اردو میں جمع کیا۔ یہ سرمایہ اپنے معیار و مقدار کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کا ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ ذیل میں اس قسم کی ایک کوشش کی جاتی ہے۔

مولانا شبلی کی "الفاروق" دسمبر ۱۸۹۹ء میں سامنے آئی۔ اس کے حصۂ اول میں مسلمان مؤرخوں اور فن تاریخ کے اصول و طریق کار سے متعلق عمدہ توضیحات پیش کی گئی ہیں۔ قدما کی تصنیفی خصوصیات، واقعات کو بیان کرنے کے طریقے، فلسفۂ تاریخ کے فن کی ایجاد، تاریخ کے لوازمات، قدیم تاریخوں کے نقائص اور ان کے اسباب، واقعات کی صحت کا معیار، غرض یہ کہ سب تحقیقی پہلو

انھوں نے عمدگی کے ساتھ پیش کیے ھیں۔ اور اس آخری نکتے کی توضیح یعنی واقعات کی صحت کے معیار کے سلسلے میں اسلامی فنِ تحقیق کے دو گراں قدر اصول ؛ روایت و درایت بھی بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیے ھیں۔ اسی کے ذیل میں جرح و تعدیل سے متعلق بھی عمدہ توضیحات پیش کی گئی ھیں اور اس سلسلے کو یہاں تک وسعت دی ھے کہ شاہ ولی اللہ کی گراں قدر تصنیف "ازالۃ الخفأ" تک پہنچایا ھے اور واقعات کی تحقیق و تنقید کے لیے درایت کے اصولوں کی تشریح کی ھے، اور یہ بھی بتایا ھے کہ اصول درایت سے تحقیق کے کن کن فیصلہ طلب امور کا پتا لگ سکتا ھے۔

یہ تو پہلو تھا تحقیقی اصول و طریقِ کار کی توضیح سے متعلق، لیکن اسی ذیل میں مولانا شبلی نے اس نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کیا ھے کہ تاریخی تحقیقات کے لیے کس قسم کا طریقۂ تحریر موزوں تر ھے اور یہ کہ تاریخی تحقیق سے متعلق کتابوں کی ترتیب اور اصول تحریر کے متعلق کیا کیا اور امور قابل لحاظ ھیں۔ غرض کہ "الفاروق" کے مقدمے میں انھوں نے تحقیقی اصول و طریقِ کار سے متعلق مفید توضیحات کی ایک مضبوط بنیاد رکھ دی اور یہ سب کچھ انھوں نے فن تاریخ کے تناظر میں پیش کیا ھے۔

اب ھم مولانا شبلی کی ایک اور گراں قدر کوشش کی طرف آتے ھیں جو انھوں نے اسلامی تحقیقی طریقِ کار سے متعلق توضیحات پیش کرنے کے لیے اپنی گراں قدر تصنیف "سیرۃ النبی" جلد اول کے مقدمے میں کی ھے۔ اس مقدمے میں انھوں نے سلسلۂ روایات کو اسلامی تاریخ کے تناظر میں علمائے سلف کے مقرر کردہ اصول کے مطابق پیش کیا، بے اعتدالی اور قیاس آرائی سے پرھیز کیا اور عقلی اصولوں سے کام لیتے ھوئے حقائق کا سراغ لگانے کی تلقین کی، سلسلۂ

روایات کی تنقید کی اور ان اصولوں کی توضیحات پیش کیں جو محققین کے لیے آج تک مشعل راہ ہیں۔ مولانا کے پیش نظر وہ اصول تحقیق ہیں جن کا بہترین نمونہ احادیث کی تدوین میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے مقدمے میں محدثین کے اصول روایت و درایت کی توضیح کی ہے اور اس کے ساتھ ہی موضوعات کے مسئلے کو بھی مناسب اہمیت دی ہے، اور ملا علی قاری کے اصولِ موضوعات کی نہ صرف نکتہ بہ نکتہ توضیح کی ہے بلکہ مثالیں دے کر ان تحقیقی اصولوں کے انطباق کی تشریح بھی کی ہے جس سے ہمارے آج کے نوجوان محققین بیانات کی تحقیق کا فن سیکھ سکتے ہیں۔ مولانا شبلی نے نقد و جرح اور روایت و درایت کے تمام محدثانہ تحقیقی اصولوں سے کام لیتے ہوئے سیرۃالنبی صلی اللہ علیہ وسلم مرتب کی ہے۔

مولانا شبلی واقعات میں سلسلۂ علت و معلول قائم کرتے ہیں اور واقعے کی نوعیت کے لحاظ سے شہادت کے معیار کو قائم کرتے ہیں۔ جرح و تعدیل کے وضع کردہ اصولوں پر زور دیتے ہیں اور تاریخ و روایت میں حوالۂ اِسناد کو مقدم سمجھتے ہیں۔ مولانا نے آئندہ کام کرنے والوں کے لیے واقعات کی تحقیق، ترتیب، دروبست اور اخذِ نتائج کا نہایت اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ ان سب باتوں پر مستزاد مولانا کا طرز تحریر ہے۔ ان کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت کے اصول جانتے ہیں اور تحقیقی مسائل پر اس فن کی مناسبت سے زبان استعمال کرتے ہیں۔ غرض کہ یہ مقدمہ معلومات و مباحث کے لحاظ سے تحقیقی اصول و طریقِ کار پر ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاہم اس قسم کی توضیحات میں اختلافات کی گنجائش رہتی ہے۔ چنانچہ ابوالبرکات داناپوری نے اپنی قابل قدر تصنیف "اصح السیر"

کے مقدمے میں مولانا شبلی کی بعض توضیحات پر محاکمہ کیا ہے۔ وہ روایت کی توضیح میں مولانا شبلی سے اس بنا پر اختلاف کرتے ہیں کہ یورپ نے جو سطحی تعلیم ایشیا میں پھیلادی ہے اس کا ایک اثر ہمارے نوجوانوں پر عجیب و غریب پڑا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہر بات کو عقل کے معیار پر جانچ کر قبول کرنا چاہیے اور جو بات عقل کے خلاف ہو اس کو رد کر دینا چاہیے۔ علم، سمجھ، رائے، وہم، قیاس وغیرہ کے فرق سے بالکل نابلد ہیں۔ صاحب اصح السیر کہتے ہیں کہ بظاہر یہ بات بہت معقول ہے، مگر لوگ ہر ایک چیز کو جو ان کی رائے میں ٹھیک نہ ہو خلافِ عقل کہہ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو مولانا شبلی کے ایک بیان سے بڑی مدد ملی ہے۔ مولانا سے تسامح ہوا ہے کہ اول وہ درایت اور عقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں، دوسرے یہ کہ درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ غرض کہ صاحب اصح السیر نے بھی اصول درایت کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر سے قابل توجہ توضیحات پیش کیں جو مولانا شبلی کی توضیحات کے بعد اپنی جداگانہ اہمیت رکھتی ہیں۔

مولانا شبلی کے بعد تحقیقی اصول و طریقِ کار سے متعلق توضیحات کی خدمت حافظ محمود شیرانی کے حصے میں آئی۔ اردو میں جدید تحقیق کے اصولوں اور طریقوں کو ایسی خوبی اور مضبوطی کے ساتھ برتنے والا جیسا کہ شیرانی تھے شاید ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ ان کے بعد یقیناً اردو تحقیق آگے بڑھ گئی ہے کیونکہ معلومات کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے؛ لیکن حزم و احتیاط اور دلائل کی مضبوطی اور معاملۂ زیر بحث کی تنقیح اور اخذِ نتائج کے معاملے میں تو آج بھی شیرانی سب سے بلند و بالا مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کا عملی تحقیق پر کام خود اپنے اندر ایک خاموش تعلیم تحقیقی اصول و طریقِ کار کی

رکھتا ہے لیکن انھوں نے شہادت کلام سے متعلق عمدہ توضیحات بھی اپنے ایک مقالے "یوسف و زلیخائے فردوسی" میں پیش کیں جو ۱۹۲۲ء میں رسالہ اردو میں شایع ہوا تھا (یہ توضیحات تحقیق شمارہ سوم میں بھی شامل ہیں) وہ صراحت کرتے ہیں کہ ادبی تحقیق میں واقعاتی شہادت کے علاوہ شہادتِ کلام ایک زبردست آلہ ہے۔ اس کے تحت وہ زبان کی نبض شناسی کو لازم قرار دیتے ہیں تاکہ زبان میں تجریدی تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کے حقائقِ زیست و سمات سے واقفیت حاصل کرکے ہم عمدہ نتائج حاصل کر سکیں۔ ایک اور اصول جس کی وہ وضاحت کرتے ہیں اسالیبِ ایامی کا اصول ہے جس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان شکل و صورت، رنگ روپ، طبیعت اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اسالیب میں بھی انفرادیت رکھتے ہیں اور اس انفرادیت کی تحقیق کی جانی چاہیے۔ شہادتِ کلام کے سنہرے اصول کا نام انھوں نے اسالیبِ مقامی رکھا ہے جس سے مراد وہ بعض خصوصیات ہیں جو کسی خطۂ ملک میں رائج ہیں۔ شہادت کلام کا چوتھا اصول اسلوبِ خصوصی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایک محقق کسی مصنف کی ان تمام خصوصیتوں کی جو اس کی تصنیف کے خصوصی خط و خال ہیں، سراغ رسانی کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جس طرح ایک اینٹ کسی ماہر آثار قدیم کے لیے دفترِ احوال کی ایک الگ فرد ہوتی ہے اسی طرح ایک کتاب کیا اس صاحب تصنیف کی ہستی کو مشخص کرنے کے لیے قابل اعتبار شہادت نہیں بن سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیرانی نے شہادت کلام کے ان چار اصولوں کی توضیحات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر انھیں برتنے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔ اور ہم انھیں اردو میں جدید تحقیق کے اصول و طریقِ کار کا معلم اول کہہ سکتے ہیں۔

شیرانی کے بعد بہت سے فضلاؑ نے اردو تحقیق کی طرف توجہ کی۔ لیکن تحقیقی اصول و طریقِ کار کی توضیحات کی طرف توجہ کم رہی۔ یہاں ہمیں نیاز فتح پوری کے ایک مقالے کا ذکر کرنا چاہیے جو رسالہ نگار کے انتقاد نمبر ۱۹۴۶ء میں شامل ہے اگرچہ یہ مضمون انھوں نے استقرائی تنقید کا ایک عملی نمونہ پیش کرنے کے لیے لکھا ہے اور اس میں غالب کے حالات سے بحث کی ہے لیکن فی الحقیقت یہ تحقیقی اصولوں کو تنقید میں استعمال کرنے کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ اردو تنقید کو تحقیق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ایک ایسی کوشش تھی جس میں عملی تحقیق کے اصولوں اور طریقوں کو برت کر دکھایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک اچھی کوشش تھی اور ہم سمجھتے ہیں کہ نیاز فتح پوری کی یہ کوشش ہمارے اس جائزے میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔

(۲)

اس کے بعد پاکستان ہندوستان میں جامعاتی تحقیق کا نسبۃً بڑے پیمانے پر آغاز ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جدید تحقیقی طریقِ کار پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک مضمون ہمیں "رسالہ برگِ گل" ۱۹۵۸ء اردو کالج کراچی میں ملتا ہے۔ اس مقالے کو ڈاکٹر صاحب نے "انجمن اردو اساتذہ کراچی یونیورسٹی" کے جلسے میں ۱۸ جولائی ۱۹۵۸ء کو پڑھا تھا۔ زیر بحث مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے جامعاتی تحقیق کے بارے میں اہم مسائل اٹھائے ہیں اور نکتہ بہ نکتہ بحث کی ہے اور طلبہ کے لیے تحقیق اور اس کے طریق کار کے بارے میں اچھی منصوبہ بندی پیش کی ہے۔ اپنے مقالے میں ڈاکٹر صاحب جامعات میں تحقیقی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اوّل

ترجیم ریسرچ اسکالرز کی عملی تحقیق کے جدید طریق کار سے ناواقفیت کو دیتے ہیں اور سب سے اہم مسئلہ موضوع کے انتخاب کا بتاتے ہیں اس کے لیے وہ اختصار کو اہمیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تحقیق کے حدود کا تعین بے حد ضروری ہے۔ بنیادی طور پر موضوع کا انتخاب اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے اس کی تشکیل ایسی ہو کہ غیرضروری وسعت ختم ہوتی چلی جائے تاکہ یہ کام بحسن و خوبی سمیٹا جا سکے۔ اگلا نکتہ وہ خاکے کی تیاری سے متعلق اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ موضوع کی منظوری اس وقت تک نہ دی جائے جب تک متعلقہ موضوع پر طالب علم ایک مختصر مقالہ نہ لکھے۔ ڈاکٹر صاحب Documentation Centre قائم کرنے کی ضرورت محسوس کراتے ہیں، تاکہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کی رہنمائی ہو سکے وہ Bibliography مرتب کرنے کی تربیت کو طلبہ کے لیے ناگزیر بتاتے ہیں۔ اپنے اس مقالے میں تحقیق کے لیے تلاش حق اور تلاش حقیقت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تحقیقی مقالے کے لیے وہ ایجاز و اختصار کو مقالے کا اہم وصف کہتے ہیں اور توازن پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ طویل نویسی کے باعث اکثر تحقیقی مقالے غیر متوازن ہو جاتے ہیں اس لیے انہیں حشو و زوائد سے پاک ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ملک کے مشہور محقق ہیں ان کا تحقیقی کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہم سردست ان کے ایک مضمون "فن تحقیق" کا ذکر کریں گے۔ یہ مقالہ پہلی مرتبہ کل پاکستان اردو تدریس کانفرنس منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۶۲ء میں اجمالاً پیش کیا گیا۔ اس کے بعد یہ مقالہ طلبہ میں تحقیقی و تنقیدی شعور کی تخلیق کے زیر عنوان شعبۂ اردو، جامعہ سندھ کے مجلے "صریر خامہ"

۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر سامنے آیا۔ اس کے بعد ترمیم اور اضافے کے ساتھ "توسیعی خطبے" کے طور پر سندھ یونیورسٹی میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۵ کو پیش کیا گیا۔ یہ توسیعی خطبہ بعد میں "رسالہ نقوش لاہور" جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اور پھر کتابی صورت میں سامنے آیا۔

اب ہم اس مضمون کے اہم پہلوؤں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اول ڈاکٹر صاحب اس رجحان کو رد کرتے ہیں کہ آج کل کے اکثر تحقیقی مقالات میں اصل موضوع سے متعلق بہت کم مواد ہوتا ہے اور غیر ضروری مباحث کے لیے کوئی ایک دو نہیں بلکہ متعدد ابواب ہوا کرتے ہیں اور غیر متعلق اقتباسات سے مقالات کا حجم بڑھایا جاتا ہے۔ ایسی سرسری "تحقیق" عام ہے جس میں تحقیق اور جانچ پڑتال سے بہت کم واسطہ ہے۔ وہ یہ بھی صراحت کرتے ہیں کہ تحقیق بہ ظاہر تنقید سے مختلف ہے مگر یہ دونوں فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان ضروری تصریحات کے بعد وہ بالخصوص مولانا شبلی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ اسلامی طرزِ تحقیق کیا ہے اور اس سلسلے میں راویوں کی چھان بین اقسامِ احادیث، روایت و درایت کے اصول ان سب پر عمدہ طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ انسان طبعاً اپنی رائے سے مطابقت رکھنے والی چیزوں کو بغیر چھان بین کے قبول کر لیتا ہے، لیکن ایک محقق کے لیے اصول عادت، قواعدِ سیاست، طبیعت تمدن اور اجتماع انسانی کے احوال پر نظر رکھنی ضروری ہے، کیونکہ انسان کے زمان و مکاں کا واسطہ ان ہی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مغربی اصولِ تحقیق کو لیتے ہیں جس کی توضیح بالخصوص Carter V. good اور ڈاکٹر Hollis کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے

مقالے کا ایک نہایت اہم حصہ داخلی و خارجی شہادت سے متعلق تصریحات ہیں جس میں بڑے کام کی باتیں بیان کی گئی ہیں، مزید یہ کہ داخلی شہادت کے ذیل میں ولی کے دیوان کی پہلی غزل کا تجزیہ کرکے عملی طور پر یہ بتایا ہے کہ ان اشعار سے ولی کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اشعار کا یہ تجزیہ داخلی شہادت کی ایک نہایت کامیاب مثال ہے، جس سے تحقیق کے طلبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بتاتے ہیں کہ داخلی شہادت سے اصلی اور الحاقی کلام کے درمیان حد فاصل بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ وہ قطعات تاریخ کی تحقیق میں اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور آخر میں تحقیق کے طلبہ کے لیے چند مفید نکات پیش کرتے ہیں۔ غرض کہ یہ گراں قدر مقالہ تحقیق کے اصول و طریق کار کی تعلیم کے لیے ایک اچھی بنیاد بننے کا پورا سامان رکھتا ہے۔ اور یہی ہوا، اس مقالے سے تحقیق کے طلبہ کو بڑی مدد ملی ہے۔

برصغیر کی جامعات میں اصول تحقیق کی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرنے والوں میں اور کامیابی کے ساتھ عملی اقدام کرنے والوں میں ہمارے علم و اطلاع کے مطابق ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں اولیت رکھتے ہیں، گو کہ اس کی ضرورت اوّل اوّل محسوس کرنے والوں میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نام آتا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے۔

(۳)

بھارتی جامعات میں اس کام کی طرف توجہ اور عملی اقدام دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے کیا اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مخطوطہ شناسی کا کورس شروع

کیا۔ تحقیق و تدوین کے مسائل پر مختلف مضامین تو لکھے گئے لیکن اس موضوع پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی۔ اس کورس کی ضروریات کے پیش نظر ڈاکٹر خلیق انجم نے تدوین متن کے مسائل پر "متنی تنقید" کے نام سے کتاب لکھی جو اس موضوع پر اولیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد اور احباب نے بھی قلم اٹھایا جس کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا جائے گا۔ ان سب فضلاء نے متنی تنقید کے اصول مغربی مصنفین کی کتابوں سے اخذ کیے ہیں اور اس بات کی اب بھی گنجائش موجود ہے کہ تدوین متن کے اصول و طریق کار مزید مثالی کاموں سے اخذ کیے جائیں۔ مراد یہ کہ مثلاً شیرانی کے اصول تدوین بہت کچھ ان کے مرتب کردہ "مجموعۂ نغز" سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے اول درجے کے فضلاء نے تدوین کے جو کارنامے پیش کیے ہیں ان سے بھی تحقیقی اصول و طریق کار کی توضیحات میں مدد اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اب ہم ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "متنی تنقید" کا ایک معروضی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کو دو اہم عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور پھر اسی میں ذیلی عنوانات قائم کرکے توضیحات و تشریحات مع امثال پیش کی ہیں۔ پہلا حصہ "تیاری اور مواد کی فراہمی" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ذیلی عنوانات کے تحت درج ذیل نکات پر بحث کی گئی ہے: بنیادی نسخہ، موازنے کا طریقہ، اختلافات نسخ کے مسائل، متنوں کی مختلف قرأتیں، اردو رسم خط کی دشواریاں، متن کی تصحیح۔

دوسرا اہم باب اعلیٰ تنقید کے ضمن میں ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے سب سے اہم پہلو یہی ہے۔ اس بارے میں صاحب کتاب یہ عنوانات قائم کرتے ہیں: متن مستند ہے یا غیر مستند، سرقہ،

مصنفین کے ناموں کی مماثلت، عوام کی عقیدت، جعلی نسخے، متن کی آزمائش، متن کے سنِ تصنیف کا تعین، ماٰخذ کی نشان دہی۔

ڈاکٹر صاحب نے متنی اور ادبی دونوں تنقیدوں کے بارے میں یہ توضیح پیش کی ہے کہ دونوں سائنسی ہیں۔ ان اصولوں اور ضابطوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو اس ضمن میں کام میں لائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ متنی تنقید کے اصول بدلتے نہیں ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے متن پر کام کرنے والوں کے لیے کچھ رہنما اصول ہیں۔ اس میں اولیت "تیاری اور مواد کی فراہمی" کو حاصل ہے۔ جس نسخے پر کام کرنا ہے اگر اس کا بنیادی نسخہ مل جائے تو جتنے نسخے موجود ہیں ان کی تلاش جاری رہنی چاہیے تاکہ موازنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اصل نسخہ کون سا ہے جس عہد کے نسخے پر کام کرنا ہے اس کے ساتھ مختلف زمانوں کے منتخب نسخے بھی زیرِ مطالعہ ہونے چاہییں تاکہ اختلافاتِ نسخ کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ محقق کو جس عہد کے شاعر یا مصنف پر کام کرنا ہو اس عہد کی زبان، ادبی تاریخ، تحاریکِ سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ پر پورا عبور حاصل ہو۔ مصنف کے حالات زندگی سے بھی پوری واقفیت لازمی امر ہے۔

اب ہم اعلیٰ تنقید کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی توضیحات پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ متن کے مستند یا غیرمستند ہونے کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ سرقے کے بارے میں اردو اور فارسی اشعار کی متعدد مثالیں دے کر اس عنوان کو وقیع بنادیا ہے۔ اسی باب میں مصنفین کے ناموں کی مماثلت کا بھی ذکر ہے۔ متن کی آزمائش کا بڑا مرحلہ اصل نسخوں کے جعلی نسخوں کی موجودگی ہے۔ اس کی وضاحت بڑے مدلل انداز میں کی ہے متن کے سنِ تصنیف کا تعین بھی ایک مسئلہ ہے جس کو زیرِ بحث

تصنیف کی داخلی اور خارجی شہادتوں سے حل کیاجا سکتا ہے۔ اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے متنی تنقید کے لیے جدید اصول اور سائنٹفک طریقِ کار واضح کردیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب "اصول تحقیق و ترتیب متن" کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین اپنے مقالے "اردو میں تحقیق و تدوین" مشمولہ سہ ماہی اردو، ۱۹۸۴ء میں کہتے ہیں "یہ اتنی بلند پایہ ہے کہ اب اردو میں اس سلسلے میں کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا۔"

ڈاکٹر علوی نے متن کی ترتیب و تحقیق سے متعلق جملہ حقائق اور مسائل کو دس ابواب میں تقسیم کرکے علیحدہ عنوانات اور ذیلی عنوانات قائم کرکے بحث کی ہے اور معروضی انداز اور استدلال کے ساتھ حقائق سامنے لائے ہیں۔ منطقی استدلال کے ذریعے زیر بحث عنوانات کی تشریح و توضیح مثالوں کے ساتھ پیش کی ہے۔ ان کے شفاف مطالعے نے ترتیب متن کی الجھنوں کو دور کیا ہے۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ تحقیق کی بنیاد ان متون پر ہے جن سے حقائق اور مسائل کے معیار کا تعین کیا جاتا ہے۔ متن کا قابل استناد ہونا بھی ضروری ہے۔ ترتیب متن کا کام سائنسی اصولوں پر ہونا چاہیے۔ جس متن کی تالیف مقصود ہو اس کے ماٰخذ کی جستجو اور مصادر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اردو ادب پر کام کرنے والوں کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وسائل کی کمی ہے۔ کتب خانے اول تو بہت کم ہیں، اگر ہیں بھی تو ان میں فہرستیں ناپید ہیں۔ ذاتی ذخیروں میں موجود نایاب نسخوں

اور نادر مخطوطوں تک رسائی اور بھی مشکل ہے۔ متن حاصل کرنے کے بعد تنقید متن پر کام کیا جائے۔ متن سے متعلق داخلی اور خارجی حقائق پر روشنی ڈالی جائے۔ تنقید متن کے بارے میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں معروضی اور موضوعی مطالعہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں عصری معلومات، تاریخی حقائق، تمدنی ماحول، تنقیدی میلان، تہذیبی ماحول متنی محاسن، ادبی اور لسانی خوبیاں سب کو زیربحث لانا چاہیے۔ جس متن پر کام کرنا مقصود ہو اس دور کے دیگر مخطوطات بھی زیر مطالعہ ہونا چاہییں۔ اس سے متن کے حدودِ زمانۂ تالیف یا نسخِ مختلف کے بارے میں معلومات مل جاتے ہیں۔ نثر و نظم دونوں متون میں الحاق و اضافہ اور تصرفات کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ مؤلف کو ان پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ تحقیقی تقابلی مطالعے کی مدد سے متن میں اصلاحات و اضافات کے زمانے کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی زمانے کے تعین میں مددگار ہو سکتا ہے۔ کتابت متن کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں بھی چند اصول بیان کیے ہیں جن کی مدد سے طالبانِ تحقیق معروضی و موضوعی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب حدود کے ساتھ تاریخِ کتابتِ متن یا زمانۂ تحریر پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

تحقیقِ متن پر کام کرنے والوں کے لیے سب سے مشکل اور اہم مرحلہ تصحیحِ متن کا ہے اس بارے میں فاضل محقق کی رائے ہے کہ متن کا مطالعہ بڑے غور و خوص سے کرنا چاہیے۔ ذرا سی لغزش سارے کام پر پانی پھیر سکتی ہے۔ اسکالر اس میں تحقیق و تفحص کی مدد سے حقیقت کا سراغ لگاتا ہے اس لیے کہ انداز بیان اور مذاق

سخن میں تیز رفتار تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ متن کی تصحیح کے لیے زبان پر دسترس بے حد اہم ہے جس عہد پر کام کرنا ہو اس کے املائی رجحان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ املائی اور لسانی مباحث مخطوطے کی زبان اور لب و لہجہ کے تعین میں مدد دیتے ہیں۔ ادبی متن کے سلسلے میں الفاظ کی لسانی ہیئت، فقروں کی ترتیب لب و لہجہ کا انداز، لغوی اور لسانی تحقیق بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

صاحبِ کتاب ترتیبِ متن کے سلسلے میں حاشیہ نگاری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے شیرانی کے مرتب کردہ "مجموعۂ نغز" کے دیباچے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ حاشیہ نگاری کا عمل ہر جگہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کا انحصار متن کی انفرادی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ ایک محقق اس ضمن میں اپنے وسائل اور استعداد ہی بھروسہ کر سکتا ہے۔

ترتیب متن کا آخری مرحلہ "تعلیقاتِ متن" ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے مفصل توضیحات پیش کی ہیں۔ کتابیات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصل اور اہم مآخذ کی فہرست احتیاط اور صحت کے ساتھ تیار کی جائے اور انھیں مآخذ، مصادر یا مراجع کے عنوانات کے تحت پیش کیا جائے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب "اصول تحقیق و ترتیب متن" اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کرتی ہے، اور متن پر کام کرنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہوئی ہے۔

(۴)

اب ہم ایک اور محقق ڈاکٹر سید محمد عقیل کے مقالے "تحقیق اور مواد کی فراہمی" کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ رسالہ نقوش شمارہ ۱۰۷ مئی ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہو کر سامنے آیا۔ اپنے مضمون

کی ابتداء میں فاضل محقق نے ادب اور ادیب کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ محقق کو ایک خاص مزاج کا حامل ہونا چاہیے۔ ایمان داری اور توازن اس کے مزاج کی خصوصیت ہو۔ موضوع کے تعین پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ موضوع کا تعین محقق کی دل چسپی کے مطابق ہونا چاہیے۔ صاحب مقالہ آگے چل کر ایک بہت اہم مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں تحقیق میں نہ محقق کا منصب متعین ہے نہ طریق کار اور مواد کی فراہمی میں آسانیاں جو جدید دنیا میں روز بروز مروج ہو رہی ہیں۔ وہ رائے دیتے ہیں کہ موضوع کے تعین کے وقت ہی محقق اپنی دل چسپی اور قوت مطالعہ وغیرہ کا اندازہ لگائے۔ اس کے بعد مواد کی فراہمی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اصل اہمیت مواد کی فراہمی کی ہے جس پر تحقیقی کاموں کی تکمیل کا انحصار ہے اور اب تک ہمارے ہاں وہ آسانیاں مہیا نہیں ہو سکی ہیں جو جدید وسائل سے مالا مال ملکوں کو میسر ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے محققین نے ان تمام دشواریوں پر قابو پا کر بہترین تحقیق کے نمونے پیش کیے ہیں۔ فن تحقیق کے ارتقا کے لیے اردو میں ببلیو گرافی نگاری کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار رقم طراز ہیں کہ مغربی ممالک میں تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے اہم ببلیو گرافیاں موجود ہیں۔ متعلقہ موضوع پر جدید کتابوں کی فہرست اور اس موضوع پر جہاں بھی جو مواد موجود ہے یکجا مل جاتا ہے، اور محقق کے لیے کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں اردو ادب کو معرض بحث میں لاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تحقیق کا کام ہمارے ہاں سائنٹفک ڈھنگ سے بہت کم کیا گیا ہے۔ ببلیو گرافی پر تو ماسوا چند کتب خانوں

یہ کام کہیں نظر نہیں آتا۔ اس ذیل میں سرِ فہرست ڈاکٹر زور، پروفیسر مبارز الدین رفعت، نصیر الدین ہاشمی اور نوائے ادب اور قومی زبان جیسے رسالے ہیں جو رفتار ادب کے عنوان سے تحقیق کے لیے مواد پیش کرتے رہے ہیں۔ صاحب مقالہ بزرگ محققین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر اس کام کو پہلی ترجیح کے طور پر کریں۔ اس لیے کہ نئی نسل کے وسائل و ذرائع اتنے محدود ہوتے جا رہے ہیں کہ آئندہ صحیح معنوں میں تحقیقی کام کرنا دشوار تر ہوتا جائے گا۔ فاضل محقق نے مخطوطوں کے حصول کی دشواری کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے اس ضمن میں یوروپین ممالک کے مخطوطات اور محققین کی دشواریوں کا بھی اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مسئلے کا حل انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ہم مخطوطوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور بڑے بڑے ادارے قائم کیے جائیں جو قیمتہً ان مخطوطوں کے عکس حاصل کر سکیں۔ بہ طور خاص انجمن ترقیٔ اردو کو اس سلسلے میں قدم اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے راوی اور روایتوں کے بارے میں بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں اور قدیم کتب سے حوالے دیتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح راویوں کی غلط بیانوں سے تحقیق میں سقم پیدا ہوتا ہے۔ محقق کے لیے جذباتی ہونا بھی خطرناک اور مضرت رساں ہے۔ خود نوشت سوانح عمریوں، خطوط اور مصنف کے اپنے بیان سے بھی غلطی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ تحقیق کو "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کی حد تک حالات اور واقعات کے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تحقیق میں واقعات اور بیانات کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کو بیان کرنے میں حزم و احتیاط لازم ہے۔ ذرا سی لغزش ادب میں بے بنیاد باتیں پھیلانے کا ذریعہ

بنتی ہے اور پھر نسل در نسل یہ مفروضے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے بقول صاحب مضمون، بزرگ محققین پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تحقیقی کاموں کے لیے ڈاکٹر صاحب لائبریریوں کو جزولاینفک قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لائبریریاں حکومت کی مدد سے مائیکرو فلم اور روٹو گراف کا بندوبست کریں تاکہ محققین کے لیے کام میں آسانی اور وسعت پیدا ہو سکے اور انھیں ادھر ادھر نہ بھٹکنا پڑے۔ اس طرح نایاب کتابیں بھی تلف ہونے سے بچ سکتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنے اس مضمون میں تحقیقی اصول اور طریقۂ کار سے متعلق بڑی عمدہ توضیحات و تصریحات پیش کی ہیں جن پر عمل کرکے اعلیٰ تحقیقی نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاراللہ نظر کا بھی ایک بلند پایہ مقالہ "تدوین کے اصول و مدارج" پیش نظر ہے۔ یہ مقالہ سہ ماہی اردو شمارہ ۳-۴ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے تدوین کو ایک بسیط فن کہا ہے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ ناقد ہو یا مؤرخ، مفسر ہو یا محقق، سب پہلوں کی فراہم کردہ معلومات پر تکیہ کرتے ہیں۔ مدون بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے، اس عملی فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فاضل مقالہ نگار نے چھے شعبے تجویز کیے ہیں۔

۱- فراہمی متن ۲- ترتیب متن ۳- تصحیح متن ۴- تحقیق متن ۵- تنقید متن ۶- توضیح متن یا تحشیہ، اس کے بعد مقدمہ نگاری۔

فراہمی متن کے سلسلے میں وہ دو باتیں کہتے ہیں اول یہ کہ وہ یکجا ہو دوم منتشر حالت میں ہو۔ اگر یکجا ہو تو کرنے

کا کام بس اتنا ہے کہ اصل مخطوطے سے اسے نقل کرلیا جائے ، وہ صراحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی چند قباحتیں ہیں آیا وہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو یا اصلاح کیا ہوا ہو یا اس کی نظر سے گذر چکا ہو اسے لازماً منتخب متن ہونا چاہیے ۔ فراہمی متن کے بارے میں دوسری اہمیت مصنف کے تلفظ و املا کی ہے ، کیونکہ یہ مصنف کی علمیت کا اظہار بھی ہوتے ہیں اور ان کی لسانی اور تاریخی اہمیت بھی ہوتی ہے ۔ مصنف اور کاتب کے درمیان جو بُعد مکانی اور بُعد زمانی ہے اس کا لحاظ بھی ضروری ہے ۔ اس سلسلے میں وہ توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مُدوّن متن میں تو مصنف کا اتباع کرے لیکن حاشیے میں کاتب کے مسلک کی نشان دھی کرنی چاہیے تاکہ دونوں کا تجزیہ کیا جا سکے ۔

ترتیب متن کے بارے میں وہ ان مسائل کی نشان دھی کرتے ہیں جن سے مدون کو دو چار ہونا پڑتا ہے ۔ ترتیب متن کو وہ مدون کی صوابدید پر چھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ ترتیب کلی طور پر مدون کے منشا اور مزاج پر منحصر ہے ۔ البتہ مقدمے میں ان تبدیلیوں کا ذکر کرنا چاہیے جو مدون نے روا رکھی ہیں ۔

تصحیح متن کے بارے میں فاضل محقق کا کہنا ہے کہ "Best Text Method" کو اختیار کرنا چاہیے ۔ ایک کتاب کے کئی مخطوطے دستیاب ہیں تو ان کا تقابلی مطالعہ کر کے مناسب ترین صورت اختیار کرنی چاہیے ۔ تحقیق متن کے سلسلے میں صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ اس پر غور کیا جائے کہ متن میں کتنا حصہ الحاقی ہے اور کتنا حصہ واقعی اصلی ہے ۔ تمام مواد کا فراہم کردینا بنیادی کام ہے ، تحقیق کے بعد کوئی جزو الحاقی یا جعلی ثابت ہو جائے تو بھی مدون اپنے مقصد میں کامیاب ہے ۔

تنقیدِ متن کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاراللہ کا کہنا ہے کہ مدون متن پر تنقیدی نگاہ ڈالے اور حقائق کی روشنی میں اس کو پرکھے کہ کہیں تناقص یا تضاد تو نہیں ہے متن کے الفاظ، افراد، کتب، مقامات وغیرہ جس کا ذکر متن میں آیا ہے وہ سب حقیقی اور تاریخی شواہد کے مطابق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب توضیحِ متن کو عملِ تدوین کی آخری کڑی کہتے ہیں۔اس کی تصریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ مصنف بعض باتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے یا اختصار اختیار کرتا ہے۔ ایسے موقعے پر مدون کو ان کی تفصیل حاشیے میں دینی چاہیے۔ اس سے تفہیم متن میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ متن کی تدوین مکمل ہونے کے بعد مقدمے کا نمبر آتا ہے۔

"مقدمہ کتاب کا وہ حصہ ہے جو اپنے وجود کے اعتبار سے آخری لیکن اپنے کام کے لحاظ سے اولین ہے" (۵۶) اس میں مدون یہ بتاتا ہے کہ کن مشکلات اور مراحل سے گذر کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا جائزہ مصنف کا تعارف، اس کا عہد اور اس کے عہد کے علمی ماحول کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

حرف آخر کے طور پر ڈاکٹر صاحب بحث کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ مدون کا مقصد یہ ہے کہ وہ اہل تحقیق اور اہل تنقید کے لیے صحیح ترین مواد تمام تر تفصیلات کے ساتھ پیش کر دے۔ وہ مدون کو سائنسداں کی حیثیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ داد و ستائش سے بے نیاز ہوکر کام کرنا اور نتائج سے بے پروا ہو کر مسلسل محنت کرنا اس کا حاصل ہے۔

(۵)

اس جائزے کو مزید وسعت دی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے کا ایک نہایت اہم نام اور کام پروفیسر رشید حسن خاں کا ہے، جنھوں نے تحقیق میں سہل انگاری کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق عمدہ توضیحی مواد بھی پیش کیا۔ اسی طرح اس جائزے میں ڈاکٹر افتخار حسین کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں تحقیق کی عملی دشواریوں سے متعلق عمدہ توضیحی نکات ملتے ہیں۔ آغا افتخار حسین اپنے مضمون "اہل تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات" نگار کراچی جون ۱۹۶۵ء میں کہتے ہیں کہ ادبی تحقیق کا طریق کار جہاں تک ہو وہی ہونا چاہیے جو سائنس اور دیگر علوم میں ہوتا ہے۔ اس مضمون کا اصل نکتہ تحقیقی احتساب ہے۔ وہ تحقیق کے نتائج کے محاسبے پر زور دیتے ہیں۔

اب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک مجموعۂ مقالات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی دو جلدیں "اردو میں اصول تحقیق" کے عنوان سے سامنے آئی ہیں۔ جلد اول ۱۹۸۶ء میں اور جلد دوم ۱۹۸۸ء میں۔ اس کی مرتب ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ہیں۔ پہلی جلد تحقیقی اصول اور طریق کار سے متعلق ہے۔ دوسری جلد میں ادبی تحقیق کے جائزے اور اطلاقی تحقیق سے متعلق منتخب مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں برصغیر کے کم و بیش تمام ایسے محققین و متخصصین کی علمی کاوشوں کو نمایاں طور پر جگہ دی گئی ہے جنھوں نے اصول تحقیق کی توضیحات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں تحقیق کے طریق کار، فنِ تحقیق اور اس کے اہتمام، موضوع کا انتخاب،

مواد کی فراہمی، مواد کی ترتیب، تحقیقِ متن، تصحیح متن جیسے اہم مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تحقیق کے مفصل جائزے پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے ہند و پاک میں تحقیقی کاموں کی پیش رفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن فضلاً کے مقالے شامل کیے گئے ہیں وہ تحقیق کی قدآور شخصیتیں ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر نذیراحمد، قاضی عبدالودود، مالک رام، رشید حسن خاں، ڈاکٹر محمودالٰہی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر معین الرحمان۔ دور حاضر میں تحقیق کے مختلف مراحل کو سائنٹفک خطوط پر استوار کرنے کی یہ ایک قابل ستائش کوشش ہے۔ ڈاکٹر سلطان بخش بجا طور پر اپنے اس کام کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ وہ ایک اچھی محقق ہیں اور اردو تحقیق کا صحیح ذوق رکھتی ہیں۔ جلد اول و دوم کے مقدمے اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

آخر میں ہم اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے فہمیدہ شیخ کے مقالے "اردو تحقیق کی جائزہ نگاری" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں (جو شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ "تحقیق" شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء میں چھپا ہے):

> "جیسے جیسے کسی زبان میں تحقیق کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، اس بات کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے کہ جائزہ نگار سامنے آئیں اور اس تحقیق کی قدر و قیمت کا جائزہ پیش کریں۔ گویا یہ ایک پیمانہ ہے کسی زبان کے فروغ اور پیش رفت کا" (۱)

---

(۱) فہمیدہ شیخ: "اردو تحقیق کی جائزہ نگاری"، شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ "تحقیق"، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶۵۔

اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جیسے جیسے کسی زبان میں تحقیق اور طالبان تحقیق کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے، اس بات کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے کہ اس میدان کے نو واردوں کے لیے جدید تحقیق کے اصول و طریق کار کی وضاحتیں پیش کی جائیں۔ جو ان کی عملی تربیت میں مدد گار ہوں اور اسی ذیل میں تحقیق کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات اور در پیش مسائل سے متعلق بحثیں بھی سامنے آتی رہیں تاکہ یہ سب توضیحات و تصریحات ہمارے اسکالر صاحبان کی عملی تربیت میں مدد گار ثابت ہوں۔ جیسے جیسے جامعات اور بیرون جامعات کے علمی حلقوں میں ذوق تحقیق اجاگر ہوتاجاریا ہے، اسی کی مناسبت سے تحقیق کے اصول و طریق کار پر مفید مواد بھی چھپ کر سامنے آرہا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک پیمانہ ہے ہماری زبان میں تحقیق کے فروغ اور پیش رفت کا۔ ہماری ناچیز رائےمیں اس ذیل میں دہلی یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ نے اردو تحقیق کے اصول و طریق کار کی توضیح کی نمایاں خدمت کی ہے۔

اس تمام جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شبلی سے لے کر ہمارے آج کے دور کے فضلاء تک تحقیق کی آبیاری میں عمدہ توضیحات کے ذریعے مسلسل کوشاں رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بالخصوص برصغیر کی جامعات میں اردو تحقیق کے اصول و طریق کار کو نصاب کا حصہ بنانے کے بعد یہ ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ہمارے فضلاء نے نہ صرف یہ کہ قدیم طرز تحقیق کی توضیحات کی طرف توجہ کی ہے، بلکہ جدید تحقیق کے اصول و طریق کار سے روشناس کرانے میں بھی مفید کوشش کی ہے جس کے پیش نظر ہم اردو تحقیق کے مستقبل سے اچھی توقعات وابستہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔

کتابیات

۱- ابو البرکات داناپوری: "اصح السیر" کراچی، نور محمد اصح المطابع و کارخانۂ تجارت کتب، ۱۹۵۷ء۔

۲- ایم سلطان بخش، ڈاکٹر: "اردو میں اصول تحقیق" جلد اول و دوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۸۸-۱۹۸۶ء۔

۳- تنویر احمد علوی، ڈاکٹر: "اصول تحقیق و ترتیب متن،" دھلی، شعبۂ اردو، دھلی یونیورسٹی، ۱۹۷۷ء۔

۴- خلیق انجم، ڈاکٹر: "متنی تنقید"، دھلی، خرام پبلیکیشنز، ۱۹۶۷ء۔

۵- شبلی نعمانی: "الفاروق" طبع دوم کراچی مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۰ء

۶- شبلی نعمانی: "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم"، حصہ اول، اعظم گڑھ دارالمصنفین ۱۹۲۰ء۔

۷- غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: "تحقیقی جائزے"، سکھر، بزم غالب، ۱۹۶۸ء۔

۸- شیرانی، حافظ محمود: "مقالات حافظ محمود شیرانی"، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، طبع اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء۔

رسائل

۱- "تحقیق" شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، شمارہ دوم، ۱۹۸۸ء (مقالہ فہمیدہ شیخ، بعنوان "اردو تحقیق کی جائزہ نگاری")۔

۲- رسالہ برگ گل، کراچی ۱۹۵۸ء مجلہ اردو کالج کراچی (مقالہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی بعنوان: "علمی تحقیق کا جدید طریق کار")

۳- رسالہ نگار لکھنؤ، انتقاد نمبر، حصہ اول بابت جنوری ۱۹۴۶ء (مقالہ نیاز فتح پوری، بعنوان: "انتقادی استقراء کی ایک مثال")

۴- رسالہ نگار پاکستان، کراچی، جون ۱۹۶۵ء (مقالہ آغا افتخار حسین بعنوان: "اہل تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات")
۵- رسالہ نگار پاکستان کراچی، مارچ ۱۹۶۷ء (مقالہ آغا افتخار حسین بعنوان: تحقیق اور احتساب کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق")
۶- رسالہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۰۴ جنوری ۱۹۶۶ء (مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بعنوان: "فنِ تحقیق")
۷- رسالہ نقوش لاہور، ۱۹۶۷ء (مقالہ ڈاکٹر سید محمد عقیل بعنوان: تحقیق اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ")
۸- سہ ماہی اردو اورنگ آباد دکن، ۱۹۲۲ء (مقالہ حافظ محمود خاں شیرانی: "یوسف و زلیخائے فردوسی")
۹- سہ ماہی اردو کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۷۰ء (مقالہ ڈاکٹر انصاراللہ نظر بعنوان: "تدوین کے اصول و مدارج")
۱۰- سہ ماہی اردو کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۸۴ء (مقالہ ڈاکٹر گیان چند جین، بعنوان: اردو میں تحقیق و تدوین")
۱۱- صریر خامہ، مجلۂ شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۲ء (مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بعنوان: "طلبہ میں تحقیقی و تنقیدی شعور کی تخلیق")
۱۲- ماہ نامہ قومی زبان، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، جنوری ۱۹۷۰ء (مقالہ ڈاکٹر گیان چند جین بعنوان: "تحقیق کے مسائل")